اسوۂ حسنین رضی اللہ عنہما

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ،اللہ کی جانب سے مصطفیٰ اور مجتبیٰ یعنی چنے ہوئے تھے، اللہ نے نبوت کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا تھا، جیسے اللہ نے آپ کو نبوت جیسی عظیم ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور صحبت کے لئے بھی انسانیت کے منتخب اور برگزیدہ اشخاص کا انتخاب ہوا، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کی صحابیت کے لئے منتخب فرمایا ہے'' اختار هم الله لصحبة نبيه ،اسی طرح اللہ کی جانب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور پاک بیویاں بھی سرد وگرم کی رفاقت اور امت کے لئے خانگی اور نجی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے لئے اللہ کی جانب سے منتخب تھیں۔ ان ہی اہلِ بیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں تھی، اور ان صاحبزادیوں میں آپ کی چہیتی اور چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین جنت کی سردار قرار دیا، اور جن کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گواہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تھی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھیں اور آپ پر حیاء کا اس قدر غلبہ تھا کہ عہدِ صحابہ میں بھی شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر چوتھے خلیفہ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی اعتبار سے قریب ترین تعلق رکھنے کے علاوہ اسلام میں سبقت سے مشرف تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں ان کے مقام ومرتبہ کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جس کا دوست ہوں، علی اس کے دوست ہیں، گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعلق اور محبت کو آپ نے اپنی محبت کا معیار بنایا، اہل سنت والجماعت کے معتبر علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں کچھ یہودیوں کی سازش سے جو

فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین کو حدیث میں ''فئۃ باغیۃ'' (باغی گروہ) قرار دیا گیا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے دو صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے، جو باحیات رہے، اور ان ہی دونوں حضرات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک نسل کا سلسلہ آگے بڑھا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانانِ جنت کا سردار قرار دیا، یہ روایت اہل سنت کے یہاں کثرت سے منقول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو پکڑتے، اور کہتے: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان دونوں سے محبت کیجئے (بخاری: حدیث نمبر، ۳۷۴۷) ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کو مجھ سے محبت ہوگی، وہ ان دونوں سے محبت رکھے گا۔ (مجمع الزوائد، عن ابی ہریرۃ: ۱۸۰/۹) عجیب بات ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جسمانی طور سے بھی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مماثلت تھی، چنانچہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم اور صالحین کو ناقابل بیان صدمہ پہنچا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع پہنچی، تو اہل عراق پر لعنت بھیجی، اور ان کے لئے ہلاکت کی دعاء فرمائی، (مجمع الزوائد: ۱۹۴/۹) امام ابراہیم نخعیؒ نے خوب فرمایا کہ اگر خدانخواستہ میں قاتلانِ حسین میں سے ہوتا اور میری مغفرت کردی جاتی، نیز میں جنت میں داخل کیا جاتا تب بھی مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا کرنے سے شرم محسوس ہوتی۔ (حوالہ سابق: ۱۹۵/۹)

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ بیت سے محبت کے بغیر کوئی ایسا شخص رہ ہی نہیں سکتا، جو واقعی مسلمان ہو۔ اور جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا کوئی درجہ حاصل ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم چوں کہ سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والے اور آپ کی نسبت پروارفتہ تھے، اس لئے اہلِ بیت سے ان کو خاص تعلق تھا، بنی امیہ کا حکمراں مروان ایک بار حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا کہ جب سے ہمیں آپ کی رفاقت حاصل ہوئی ہے، مجھے آپ کی کسی بات سے ناگواری نہیں، سوائے اس سے کہ آپ حسن وحسین رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے ہیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سمٹ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، ایک جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے رونے کی آواز سنی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں، آپ تیز تیز چل کر وہاں پہنچے، اور فرمایا کہ ہمارے بیٹوں کو کیا ہوا ہے؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یہ پیاسے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشکیزے میں دیکھا تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء سفر سے پانی کے بارے میں فرمایا، تمام ہی لوگ پانی کے برتن کی طرف لپکے، لیکن اتفاق کہ کسی کے پاس پانی موجود نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باری باری حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی زبان مبارک کو چسایا، جب انہیں سکون ہوا،

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسمینان ہوا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسی لئے میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، (طبرانی بسند صحیح، مجمع الزوائد: ۱۸۰/۹) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ گلشن محمدی کے ان غنچہ ہائے سدا بہار اور گل ہائے مشک بار سے کیسی محبت رکھتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کا خوف بھی اس کے اظہار میں مانع نہ ہوتا تھا۔

لیکن کیا حضرات حسنین سے امت کی یہ محبت اور دربار رسالت مآب میں ان کا یہ درجہ ومقام صرف اسی وجہ سے تھا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے؟..... یقیناً یہ نسبت بھی اس محبت میں کارفرما ہے، لیکن اس سے بڑھ کر حضرات حسنین کا اسوہ اور ان کا کردار ہے، جو قیامت تک کے لئے نقش لافانی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر اقدس پر تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ تھے، آپ ایک دفعہ لوگوں کی طرف دیکھتے، اور ایک دفعہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف، اور ارشاد فرماتے: میرا یہ بیٹا سید (سردار امت) ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائیں گے۔ (بخاری: حدیث نمبر: ۳۷۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اہل شام حضرت معاویہ رضی عنہ کی کمان میں آگے بڑھے اور ادھر اہل حجاز اور اہل عراق حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، عام طور پر صحابہ رضی اللہ عنہ اور اکابر تابعین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان کے موقف کے مؤید تھے، اور بقول حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پہاڑوں کی طرح لشکر جرار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی رکاب میں تھا، اور یہ ایسے جان نثار لوگ تھے، کہ بہ ظاہر ان کا پشت دکھا کر بھاگنا ہرگز متوقع نہیں تھا، بہ ظاہر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے غالب آنے کی توقع زیادہ تھی، لیکن جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے صلح کی پیشکش ہوئی، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے بہت سے رفقاء کی مخالفت بلکہ ایک گونہ طعن وتشنیع کے باوجود اس پر لبیک کہا، اور اپنا ہاتھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا، تاکہ مسلمانوں کی خونریزی نہ ہو، اور اسلامی دنیا ایک جھنڈے کے نیچے آجائے، اس طرح وہ پیشین گوئی شرمندۂ تعبیر ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے سلسلہ میں فرمائی تھی، یہ کچھ معمولی قربانی نہیں تھی، اور اس قربانی نے اسلام کی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ایسی عظمت عطاء کی کہ، کہ اگر وہ پورے عالم اسلام کے متفق علیہ تاج دار بن جاتے، تب بھی شاید ان کو یہ مقام حاصل نہ ہوا ہوتا، اور لوگوں کے قلوب پر ان کی حکمرانی قائم نہ ہوئی ہوتی۔

چنانچہ ایک بار پھر پورا عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے آگیا، اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں مسلمان فاتحانہ پیش قدمی کرنے لگے، اس سے کوئی حقیقت پسند انکار نہیں کرسکتا کہ اس میں بنو امیہ کے تدبر سے زیادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ایثار کا حصہ ہے!

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یزید بن معاویہ کے مقابلہ میں کھڑا ہونا اس لئے نہیں تھا کہ آپ حکومت کی حرص وطمع

رکھتے تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خانوادۂ نبوی سے تعلق کا جو شرف حاصل تھا، اس پر ہزار حکومتیں قربان اور نچھاور تھیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ اسلام جس دور میں آیا، وہ ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کا دور تھا، اس وقت کی معلوم دنیا میں جہاں بھی چھوٹی بڑی حکومت تھی، ان کی اساس خاندانی بادشاہت پر تھی، اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح کی، وہیں نظام سیاست کی بھی اصلاح کی، اور خلافت کا تصور دیا۔

خلافت میں دو باتیں اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ اس منصب کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے، جو اخلاق و کردار کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل ہو، دوسرے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے اس کا انتخاب کیا ہو، اسی اصول پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ رکنی کمیٹی بنادی، اور ان حضرات نے عام مسلمانوں سے مشورہ اور باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد اہل مدینہ اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بہ اصرار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جن صحابہ کو اختلاف تھا، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے بارے میں تھا، ورنہ ان کی لیاقت کے بارے میں کسی کو کلام نہیں تھا، اور اس لئے علماء اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک وہی خلیفۂ برحق تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی آپ اپنی خلافت کا اعلان نہیں فرمایا، بلکہ اس عہد کے اکابر صحابہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تیس سالہ خلافت راشدہ کی پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی چھ ماہی عہدِ خلافت پر مکمل ہوجاتی ہے۔

یزید کی حکمرانی سے ایک نئے طریقہ کا آغاز ہوا، کہ بعض ایسے لوگ جو اس سلسلہ میں اسلام کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں تھے، اور ان کو براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل نہیں تھی، انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو باور کرایا کہ آئندہ کے لئے یزید کو خلیفہ نامزد کردیا جائے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم جو اس وقت موجود تھے، ان کو حکمرانی کے اس نئے طریقہ سے اس قدر اختلاف تھا، جتنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو، لیکن بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے فتنہ کے اندیشہ سے خاموشی اختیار کی، اور بعض نے امت کو اختلاف سے بچانے کے لئے بہ کراہت خاطر اس تجویز کو قبول کرلیا۔ اب اگر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس صورت حال پر یہی رویہ اختیار کرتے اور کسی کی طرف سے مزاحمت پیش نہ آتی، تو آئندہ یہ بات سمجھی جاتی کہ اسلام میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے ساتھ ساتھ عہدِ جاہلیت کی مروجہ ملوکیت کی بھی گنجائش ہے، چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کی مزاحمت کو ضروری سمجھا، یہاں تک کہ اپنے رفقاء اور اہلِ خاندان کے ساتھ نہایت ہی بے دردی سے شہید کردیئے گئے، اور قاتلان حسین نے جہاں آخرت میں اپنے لئے اللہ کے عذاب اور ابدی خسران کو محفوظ کرلیا وہیں دنیا

میں بھی قیامت تک کے لئے اہلِ ایمان کی نگاہ میں ملعون ومغضوب قرار پائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی یہ مہم بہ ظاہر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی، لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو معنوی فتح حاصل ہوئی، چنانچہ امت کے علماء وفقہاء اور اربابِ نظر آج اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام جس نظام حکمرانی کا داعی ہے، وہ خلافت ہے نہ کہ خاندانی بادشاہت، حالانکہ مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا حصہ اسی بادشاہت کا ہے، لیکن اس کے باوجود آج اسے اسلامی فکر کے خلاف کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور کیوں اس رویہ کو قبول نہیں کیا گیا؟ یقیناً اس میں بڑا حصہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مزاحمت اور اسی راہ میں شہادت کا ہے۔ ورنہ بعد کے لوگ سمجھتے کہ اس مدت پر مسلمانوں کا اجماع واتفاق ہو چکا ہے۔

پس حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اسوہ یہ ہے کہ امت کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لئے اپنے اقتدار کی قربانی گوارا کیا جائے، اور ایثار سے کام لیا جائے، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اسوہ یہ ہے کہ جب دین میں کوئی طاقت کمی بیشی کرنا چاہے اور اسلام کی صحیح تصویر کو مسخ کرنے کے درپے ہو تو چاہے اس کے لئے اپنی رگِ گلو کٹانی پڑے لیکن بہتر قیمت اللہ کے دین اور شریعت کی فکری سرحدوں کی حفاظت کی جائے، آج کے حالات میں یہ دونوں نمونے امت کے لئے مشعل راہ ہیں، امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے عہدہ وجاہ کا ایثار، اور دین کی حفاظت وصیانت کے لئے اپنی جان عزیز تک کی قربانی!!

☆☆☆

وہ لفظ اللہ بن جاتا ہے

حضرت شبلیؒ، اللہ تعالیٰ کی محبت میں فنا ہو چکے تھے، ان کے واقعات بڑے عجیب ہیں۔ ایک مرتبہ ان کو مجنون سمجھ کر کسی نے پتھر مارا، جس کی وجہ سے خون نکل آیا۔ ایک آدمی دیکھ رہا تھا، اس نے جب خون نکلتا دیکھا تو کہا کہ چلو میں پٹی باندھ دیتا ہوں، لہٰذا اس نے بچوں کو ڈرا دھمکا دیا اور ان کے قریب ہوا، وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جو قطرہ بھی خون کا نکلتا ہے وہ زمین پر گرتے ہی اللہ کا لفظ بن جاتا ہے۔ وہ حیران ہوا کہ اس بندے کے رگ وریشے میں اللہ تعالیٰ کی کتنی محبت سمائی ہوگی کہ خون کا جو بھی قطرہ گرتا ہے وہ اللہ کا لفظ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے زخم پر پٹی باندھ دی۔ حضرت شبلیؒ کے دل میں اللہ کی اتنی محبت تھی کہ جب کوئی ان کے سامنے اللہ کا نام لیتا تھا تو وہ جیب میں ہاتھ ڈالتے تھے اور جیب سے مٹھائی نکال کر اس بندے کے منہ میں ڈال دیتے تھے، کسی نے پوچھا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں کہ لوگوں کے منہ میں مٹھائی ڈالتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ جس منہ سے میرے محبوب کا نام نکلے میں اس منہ کو شیرینی سے نہ بھردوں تو پھر اور کیا کروں۔ سبحان اللہ

☆☆☆